معانی الآثار و مشکل الآثار للامام الطحاوی

از مولوی سید عبدالرزاق صاحب قادری جعفر ایم۔ اے (عثمانیہ)

امام طحاوی پر برہان کی گذشتہ اشاعتوں میں جو مسلسل ایک مقالہ شائع ہوتا رہا ہے۔ بحمد اللہ ارباب علم و ذوق نے اس کو پسند فرمایا اور تحسین کی۔ لیکن یہ مقالہ صرف امام طحاوی کے حالات و سوانح اور ان کے عصری واقعات فقہی ماحول کے تذکرہ پر مشتمل تھا ضرورت تھی کہ امام عالی مقام کی کتابوں پر بھی تبصرہ کیا جاتا تاکہ ان کی علمی خصوصیات نمایاں ہوتیں اور یہ معلوم ہوسکتا کہ فن حدیث و رجال میں آپ کا پایہ کتنا اونچا ہے۔ مقام مسرت ہے کہ امام طحاوی کی زندگی کے اس رخ پر بھی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے عالم گریجویٹ نے قلم اٹھایا۔ اور اپنے پیشروں کی طرح اپنے استاذ فیض بنیاد جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کی غیر معمولی نگرانی اور رہنمائی میں ایک علمی تحقیقی اور مفید مقالہ مرتب کردیا۔ یہ مقالہ بھی چونکہ مولانا گیلانی ایسے وسیع النظر عالم اور محقق فاضل کی رہنمائی میں مرتب ہوا ہے۔ اس بنا پر امید ہے کہ علماء اور طلبا دونوں اس کو بہت مفید اور لائق تحسین پائیں گے۔ (برہان)

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

الطحاوی بنست عادتہ نقد الحدیث طحاوی کی عادت یہ نہیں ہے کہ وہ اہل علم کی کنقد ھلا نعلم وھذا روی فی طرح احادیث کی تنقید کریں۔ اسی وجہ سے انھوں نے

شرح معانی الآثار الاحادیث المختلفة وانما رجح ما یرجح منها فی الغالب من جهة القیاس الذی راه حجة و یکون اکثره مجروحا من جهة الاسناد ولا یثبت فانه لم یکن له معرفة بالاسناد کمعرفة اهل العلم۔

معانی الآثار میں احادیث مختلفہ درج کی ہیں اور جن حدیثوں کو انھوں نے ترجیح دی ہے زیادہ تر محض قیاس کی بنا پر ترجیح دی ہے جس کو وہ حجت مانتے ہیں۔ ان حدیثوں میں سے اکثر حدیثیں اسناد کے لحاظ سے مجروح ہوتی ہیں اور ثابت نہیں ہوتیں کیونکہ امام طحاویؒ کو اسناد کی ایسی پہچان نہیں تھی جیسی کہ اس علم کے اصحاب کو ہوتی ہے۔

غیر حنفی طبقہ کے ایک مشہور عالم بلکہ امام یعنی حافظ ابن تیمیہ الحرانی الدمشقی کے یہ وہ الفاظ ہیں جو ان کی کتاب منہاج السنۃ سے نقل کئے گئے ہیں۔ مذکورہ بالا عبارت کی اگر تحلیل کی جائے تو حسب ذیل اجزا نکل سکتے ہیں۔

(۱) امام طحاوی حدیثوں کی تنقید اس طریقہ سے نہیں کرتے جو علم حدیث کے علماء کا دستور ہے۔

(۲) اس لئے ان کی کتاب شرح معانی الآثار میں ایسی مختلف حدیثیں مروی ہیں جو اسناد کے لحاظ سے مجروح اور غیر ثابت ہیں۔

(۳) اپنی تنقید میں طحاوی نے ترجیح کا ایک نیا طریقہ نکالا ہے یعنی قیاس کے ذریعہ سے وہ ایک حدیث کو دوسری حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔

(۴) اپنے اس طریقہ (ترجیح بالقیاس) کو وہ حجت اور دلیل سمجھتے ہیں جس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ واقعۃً حجت ہونے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے۔

(۵) آخر میں تو صرف شرح معانی الآثار ہی تک بات محدود نہیں رکھی گئی ہے بلکہ عام فیصلہ ان کے متعلق شیخ الاسلام نے یہ کردیا ہے کہ علم حدیث کے حذاق وماہرین کو فنِ اسناد میں جو کیفیت اور

جو رسوخ حاصل ہوتا ہے طحاوی اس کیفیت اور علمی رسوخ سے محروم تھے۔

میں اپنے اس مقالہ میں دراصل ان ہی بلند بانگ دعووں کی تنقیح کرنا چاہتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ حقیقت سے ان کا کہاں تک تعلق ہے۔

اگرچہ واقعہ یہی ہے کہ امام طحاویؒ کے متعلق یہ بحث کوئی نئی بحث نہیں ہے۔ ہم سے پیشتر ہمارے پیشرو طیلسانی نے گزشتہ سال "الطحاوی" پر جو مقالہ تیار کیا ہے اس میں چھ سو سال کی تاریخ کا خلاصہ درج کر دیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے مضمون کا بڑا حصہ امام طحاویؒ کے ذاتی حالات کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ان علمی نظریات اور فن حدیث میں جو ان کے علمی کارنامے ہیں اس باب میں ان کا مقالہ صرف تشنہ ہی نہیں بلکہ قصداً بخوف طوالت ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے میرے اس مقالہ کی نوعیت ان کے مقالہ کے تکملہ کی ہوگی۔ وما باللہ التوفیق۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا امام طحاویؒ کا فن حدیث میں کیا پایہ ہے۔ اپنی کتابوں میں خود اپنی سند سے جو حدیثیں انھوں نے روایت کی ہیں اسناداً ان کی کیا نوعیت ہے۔ یہ بڑی قدیم پرانی بحث ہے۔ البیہقیؒ نے (طحاویؒ کے ساتھ جن کے تعلقات پر ہمارے پیشرو نے کافی بحث کی ہے) اپنی کتاب "معرفۃ السنن والآثار" میں جس کا دوسرا نام "سنن اوسط" بھی ہے۔ امام طحاوی کی کتاب "شرح معانی الآثار" کی حدیثوں کے متعلق اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ

فکم من حدیث ضعیف فیہ صححہ	اس کتاب میں کتنی ضعیف حدیثیں ہیں جن کی امام طحاوی
وکم من حدیث فیہ صحیح ضعفہ	نے تصحیح کردی ہے اور کتنی صحیح حدیثیں ہیں جن کی امام
لاجل رائہ۔	موصوف نے اپنی رائے سے تضعیف کردی ہے۔

اور دراصل ان ہی الفاظ کی وہ آواز بازگشت ہے جو ابن تیمیہ کی کتاب سے میں نے ناصیہ مضمون میں نقل کیا ہے۔ صاحب طبقات حنفیہ علامہ عبدالقادر القرشی نے اپنی کتاب میں بیہقی کے ان الفاظ کو نقل کر کے

لکھا ہے کہ ۔ حاشا اللہ ان الطحاوی رحمۃ اللہ یقع فی ھذا یہ نہ سمجھا جائے امام طحاوی سے یہ فعل سرزد ہوا ہو

صرف انھوں نے زبانی تہی نہیں فرمائی ہے بلکہ آگے لکھتے ہیں۔

فھذا الکتاب الذی اشار الیہ ھو | بیہقی نے جس کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہی
الکتاب المعروف بمعانی الآثار | کتاب ہے جو معانی الآثار کے نام سے معروف ہے
وقد تکلمت علی اسانیدہ ۔ | اور میں نے اس کی سانید پر کلام کیا ہے۔

القرشی نے اس کے بعد اپنے طریقہ کلام کی تفسیر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ منجملہ اور باتوں کے ایک طریقہ میں نے ان کی کتاب کی حدیثوں کے جانچنے کا یہ بھی اختیار کیا کہ

عزوت احادیثہ واسنادہ الی | میں نے ان کی حدیث اور ان کی اسناد کو کتب ستہ
الکتب الستۃ والمصنف ابن | اور مصنف ابن ابی شیبہ اور دوسرے حفاظ
ابی شیبہ وکتب الحفاظ ۔ | حدیث کی طرف منسوب کیا ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ بیہقی اور ابن تیمیہ طحاوی کی جن حدیثوں کو ضعیف اور غیر ثابت قرار دیتے ہیں القرشی کے تتبع و تلاش نے یہ ثابت کر دیا کہ عموماً ان کی کتاب میں وہی حدیثیں ہیں جو صحاح ستہ اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ حدیث کی معتبر اور معتمد علیہا کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ گویا طحاوی کی حدیثوں کے ضعف کا دعویٰ درحقیقت صحاح ستہ وغیرہ کی حدیثوں کے ضعف کا دعویٰ ہے۔ طحاوی کی حدیثوں پر جرح ان کتابوں کی حدیثوں پر جرح ہے جن پر عام مسلمانوں کے ہی دین و ایمان کا نہیں بلکہ بیہقی اور ابن تیمیہ کے دین و ایمان کا بھی دارومدار ہے۔ ان بزرگوں کا سارا سرمایہ صحاح کی یہی حدیثیں ہیں اگر ان میں ضعف اور کمزوری پیدا ہو جائے اور وہ ناقابل اعتبار قرار دی جائیں تو پھر ان کے پاس اپنے دین کی تعمیر کے لئے مواد کہاں سے فراہم ہو سکتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ القرشی نے طحاوی کی حدیثوں کو صحاح وغیرہ سے نکال کر دکھا دیا ہے بلکہ اس باب میں ان کی جو کتاب "الطحاوی فی بیان

آثار الطحاوی" کے نام سے موسوم ہے اور جس کے لکھنے کی تاریخی وجہ انہی کے بیان سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ مصر کے ایک امیر (جن کا نام انھوں نے نہیں لیا ہے) کے پاس طحاوی کی کتاب تھی۔ ایک دن ان کے استاد قاضی القضاۃ علاءالدین المارديني یعنی صاحب "الجوہر النقی" کی خدمت میں وہی امیر آیا اور شکایت کی کہ

عندنا کتاب الطحاوی فاذا	ہمارے پاس امام طحاوی کی کتاب ہے جب ہم اپنے
ذکرنا لخصمنا الحدیث منہ	حریف کے سامنے اس کتاب کی کسی حدیث کا ذکر کرتے
یقولون لنا ما نسمع الا من	ہیں تو یہ حریف کہتے ہیں ہم بخاری اور مسلم کے سوا
البخاری والمسلم۔	اور کسی کی حدیث نہیں سنیں گے۔

اس پر علامہ ماردینی نے امیر کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا۔

الاحادیث التی فی الطحاوی اکثرھا	کتاب الطحاوی میں جو احادیث ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر
فی البخاری والمسلم والسنن وغیر	حدیثیں وہی ہیں جو بخاری اور مسلم اور سنن اور دوسرے
ذلک من کتب الحفاظ۔	حفاظ کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔

اس حقیقت پر مطلع ہونے کے ساتھ ہی امیر نے علامہ ماردینی پر اصرار شروع کیا کہ وہ ان احادیث کی تخریج کر کے ان کو ان کتب حدیث کی طرف منسوب کر دیں۔ مگر ماردینی نے جن پر مصر کے عہدۂ قاضی القضاۃ کی ذمہ داریوں کا بوجھ تھا عدم فرصت کا عذر کر کے اپنے شاگرد عبدالقادر القرشی صاحب طبقات حنفیہ کو امیر کے سامنے پیش کیا کہ ان سے یہ کام لے سکتے ہو۔ القرشی لکھتے ہیں۔

فحملنی الی الامیر واحسن الی واعدنی	مجھ کو امیر کے پاس بھیج دیا اور میرے ساتھ بڑا اچھا
الامیر بکتب کثیرۃ کالاطراف للمزی	سلوک کیا۔ امیر نے بہت سی کتابوں سے میری مدد
وتھذیب الکمال لہ وغیرھا۔	کی مثلاً اطراف للمزی اور تہذیب الکمال وغیرہ۔

اس سے اسلام کے عہد حیات کے امیروں کے مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کیا تھے اور اب ان کا

حال کیا ہو گیا۔ وتلک الایام نداولہا بین الناس۔

بہر حال الامیہ کی کتابی امدادت علامہ القرشی نے اپنی کتاب "الحاوی" کی تالیف اسی غرض سے شروع کی۔ میری غرض اس واقعہ کے ذکر سے یہ ہے کہ پھر ان کو اسی میں کامیابی نہیں ہوئی کہ جو حدیثیں طحاوی کی کتابوں میں پائی جاتی تھیں ان کو صحاح اور حفاظ کی معتبر کتابوں سے نکال کر دکھا دیا بلکہ وہ خود لکھتے ہیں کہ طحاوی کی حدیثوں کی سند میں بھی جن کے متعلق ابن تیمیہ جیسے بزرگ کا دعویٰ ہے کہ اکثرہ مجروحاً من جہۃ الاسناد ولاشک ان ہی حدیثوں کے اسناد کے متعلق ان کو یہ تماشا نظر آیا کہ

ووجدت الطحاوی قد شارک مسلماً	میں نے امام طحاوی کو امام مسلم کے ساتھ بعض شیوخ
فی بعض شیوخہ کیونس بن عبد الاعلیٰ	میں بھی شریک پایا، مثلاً یونس بن عبد الاعلیٰ بہتیری
فوقع لی فی کثیر من الاحادیث ان	احادیث میں مجھ کو یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ امام
الطحاوی یروی الحدیث عن	طحاوی یونس بن عبد الاعلیٰ سے ایک حدیث روایت
یونس بن عبد الاعلیٰ و بسوقہ و مسلم	کرتے ہیں اور اس کو چلاتے ہیں اور مسلم اسی حدیث کو
یرویہ بعینہ عن یونس بن	طحاوی کی سند سے یونس بن عبد الاعلیٰ سے
عبد الاعلیٰ بسند الطحاوی۔	روایت کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے شرح معانی الآثار کا مطالعہ کیا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کتاب کی حدیثوں کا ایک بڑا مجموعہ یونس بن عبد الاعلیٰ مصری ہی کی سند سے مروی ہے جیسا کہ ابھی القرشی کے بیان سے معلوم ہوا کہ یہ سندیں عموماً وہی ہیں جو صحیح مسلم میں موجود ہیں جس کا مطلب یہی ہوا کہ طحاوی کی کتاب میں حدیثوں کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی وثاقت واسناد کی رفعت و بلندی میں وہی درجہ رکھتا ہے جو دنیا کی اس کتاب کا درجہ ہے جسے مغرب کے علماء حدیث قرآن کے بعد دوسری کتاب قرار دیتے ہیں۔ اور ایک یونس بن عبد الاعلیٰ کی روایتوں ہی کا یہ حال نہیں ہے بلکہ علامہ القرشی الحنفی نے تجربہ اور تتبع کے

بعد اپنی یہ منصفانہ رائے قائم کی ہے کہ

> لم ار فی هذا الکتاب شیئا مما ذکره البیهقی عن الطحاوی۔
>
> بیہقی نے امام طحاوی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے میں نے اس کتاب میں اس قسم کی کوئی بات نہیں پائی۔

لیکن مذہبی تعصب کا کیا علاج؟ امام بیہقی حدیث و رجال میں جن کا تبحر مسلم ہے صرف الطحاوی کے ساتھ انھوں نے ظلم نہیں کیا بلکہ القرشی کا بیان اگر صحیح ہے تو امام بیہقی اپنی سنن کبری میں یہاں تک کر گذرتے ہیں کہ ایک حدیث اپنے مذہب (شافعیت) کی تائید میں پیش کرتے ہیں حالانکہ اس کی سند کمزور ہوتی ہے لیکن اس کی توثیق کرتے ہیں اور جب ہمارے مذہب حنفیت کے متعلق کسی حدیث کا ذکر آتا ہے اور اس حدیث میں بجنسہ وہی آدمی ہوتا ہے جس کی بیہقی ابھی توثیق کر چکے تھے تو محض اس بنا پر کہ اس کی توثیق سے حنفیوں کو مدد ملتی ہے اس کو ضعیف ٹھہراتے ہیں اور یہ کہیں کہیں ایک دو جگہ ہی نہیں بلکہ وہ اکثر ایسا ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

> بین هذین العملین مقدار ورقتین او ثلاثة
>
> بیہقی کا یہ عملی تضاد دو یا تین ورقوں میں نظر آجاتا ہے

اور پھر یہ القرشی کا محض زبانی دعوی نہیں بلکہ ان کے استاد علامہ الترکمانی المارد ینی کی تنقید "الجوہر النقی" کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ قرشی کے دعوی کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ خود انھوں نے بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں اسی تنقید کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے۔

> فمن شك فيه فلينظر فيه
>
> جس کو اس میں شک ہو وہ اس میں غور کرے

اور اب تو حکومت آصفیہ حرسہا اللہ وحماہا کے مطبع دائرۃ المعارف نے "سنن کبری" کو اس تنقید کے ساتھ شائع کر دیا ہے بآسانی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے حیرت ہوتی ہے کہ جس طحاوی کی روایتوں کا ایک بڑا مجموعہ صحیح مسلم کے ہم رتبہ ہے اور اس کے سوا بھی معانی الآثار کے مطالعہ

ے الجواہر المضیئہ حصہ اول ج ۱ ص ۲۳۲۔

کرنے والے جانتے ہیں کہ آج جس شخص کی روایت پر شافعیت کا دارومدار ہے میری مراد حضرت امام شافعی کے مشہور شاگرد اوران کے فقہی اجتہادات کے راوی ربیع المؤذن سے ہے۔ الذہبی نے جن کا شمار حفاظ حدیث میں کرتے ہوئے اپنے تذکرہ میں ان کے ترجمہ کو داخل کیا ہے۔ ترجمہ کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ الحافظ الامام محدث الدیار المصریہ ابو محمد الربیع بن سلیمان بن عبدالجبار

صاحب الشافعی وناقل علمہ

خلاصہ یہ ہے کہ الطحاوی کی روایتوں کا ایک حصہ ان ہی "ناقل علم الشافعی" یا حافظ ابن حجرؒ کے الفاظ میں "راویہ کتب الشافعی"[1] سے حاصل کیا گیا ہے۔ اور یہ دنیا کو معلوم ہے کہ جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے بھی لکھا ہے۔ وعنہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ

جس کا مطلب یہی ہوا کہ صحاح ستہ میں جن کتابوں کا شمار ہے ان کتابوں میں امام شافعیؒ کے ان ہی صاحب کی بھی روایتیں ہیں۔ وہی روایتیں الطحاوی میں بھی ان ہی سے ان ہی اسناد کے ساتھ ہیں جن کے ساتھ مذکورہ بالا اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ الطحاوی بھی اپنی کتابوں میں انھیں سے راوی ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحاح ستہ کی مشہور کتاب "جامع الترمذی" میں ربیع المؤذن کے واسطہ سے جو روایتیں ابو عیسیٰ ترمذی نے درج کی ہیں وہ براہ راست ربیع ہی سے سنی ہوئی نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ حافظ نے لکھا ہے۔ روی لہ الترمذی بواسطۃ اسماعیل

مجھے اس سے بحث نہیں کہ اسماعیل کا مرتبہ رواۃ حدیث میں کیا ہے۔ ابو حاتم رازی کی جو رائے کتابوں میں ان کے متعلق نقل کی جاتی ہے اس سے قطع نظر کر لیا جائے تب بھی سوال ہوتا ہے کہ ربیع المؤذن کی روایتیں جس کتاب میں بالواسطہ مروی ہوں ان کو تو صحاح ستہ میں داخل کیا جائے لیکن حدیث کی جس کتاب میں ان ہی ربیع سے براہ راست جو روایتیں الطحاوی نے درج کی ہیں

---

[1] تہذیب ج ۳ ص ۲۴۵۔

اور جن کی تعداد تھوڑی نہیں ہے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ باوجود اس بات کے فن حدیث میں اس کتاب کو کوئی اہمیت نہ دینا کیا انصاف پر مبنی ہو سکتا ہے۔ غور تو کیجئے کہ علاوہ یونس بن عبد الاعلیٰ اور ربیع المؤذن راویۃ الشافعی کے ہارون بن سعید الایلی جن سے مسلم ابوداؤد النسائی ابن ماجہ سب ہی راوی ہیں۔ محمد بن عبداللہ بن الحکم جو نسائی کے ثقہ رواۃ میں ہیں حدیث کے ان ثقات روات سے براہ راست امام ابوجعفر طحاوی نے اپنی کتاب میں تقریباً وہی حدثیں روایت کی ہیں جو ان بزرگوں سے صحاح کی ان ہی کتابوں میں مروی ہیں۔ اس کے بعد بھی طحاوی کی حدیثوں کو ناقابل اعتبار قرار دینے والوں کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ رائے قائم کی ہے۔ انھوں نے طحاوی کے اسناد اور رجال پر غور نہیں کیا ہے یا پھر۔ ع۔ عیب نماید ہنرش درنظر۔ تعصب کا جو قدیم اور پرانا عارضہ ہے سمجھا جائے کہ لوگ اس مرض کے شکار ہوگئے ورنہ جیسا کہ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے الطحاویؒ کے اساتذہ عموماً ابن عیینہ اور ابن وہب کے اصحاب میں سے ہیں [۱]

اور ابن عیینہ اور ابن وہب سے جو لوگ واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان بزرگوں کے تلامذہ سے کم از کم احکام کی حدثیں مشکل ہی سے مخفی رہ سکتی ہیں۔ آخر ارباب علم میں کون نہیں جانتا کہ ابن وہب حضرت امام مالک کے مصری تلامذہ میں سب سے بڑے سربرآوردہ امام ہیں۔ ایک زمانہ تک امام مالکؒ کی خدمت میں رہے ہیں اور امام مالکؒ کے متعلق ناصر السنۃ ناصر الحدیث الشافعی کا مشہور قول ہے کہ

وجدت احادیث الاحکام کلہا عند مالک سوی ثلاثین حدیثا [۲] — میں نے احکام کی تمام احادیث سوائے تیس حدیثوں کے امام مالک کے پاس پائی ہیں۔

پھر اسی کے ساتھ جب ہم اس کو بھی ملا لیتے ہیں کہ الطحاوی ابن وہب کے تلامذہ کے سوا ابن عیینہ کے تلامذہ کے بھی شاگرد ہیں ورامام شافعی نے احکام کی جن تیس حدیثوں کو امام مالک کے پاس نہیں پایا

---

[۱] میزان ج ۱ ص ۷۵ - [۲] تذکرۃ الحفاظ ص ۲۴۲ -

ان کے متعلق خود انہی کا بیان ہے کہ

ووجدتها كلها عند ابن عيينة سوى ستة[1] میں نے ان تیس حدیثوں کو سوائے چھ کے ابن عیینہ کے پاس پایا ہے

پھر جب ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ امام طحاویؒ نے امام شافعیؒ کے اکثر تلامذہ یعنی المزنی، ربیع المؤذن ربیع الجیزی، محمد بن عبداللہ بن الحکم سبھوں سے پڑھا ہے تو ابن عیینہ والی چھ حدیثیں جن کا علم امام شافعیؒ کو دوسرے ذرائع سے حاصل ہوا کیا یہ عقل میں آنے کی بات ہے کہ امام شافعیؒ کے اتنے تلامذہ کے شاگرد تک وہ چھ حدیثیں نہیں پہنچی ہوں گی۔ جس کا حاصل یہی ہوا کہ کم از کم احکام کے متعلق حدیثوں کا جو ذخیرہ تھا صحیح اسناد کے ساتھ امام طحاوی تک یقیناً پہنچ چکا تھا اور ظاہر ہے کہ الطحاوی کا دوسروں سے فن حدیث میں جو اختلاف ہے اس کا تعلق براہ راست احکامی روایات ہی سے ہے۔

اختلافِ ائمہ کی حقیقت حقیقت یہ ہے کہ احکامی ابواب میں ائمہ مجتہدین اور ان کے اتباع میں جو اختلاف ہے اس کی وجہ یہ قرار دینی کہ ان تک حدیث نہیں پہنچی تھی۔ میرے خیال میں یہ حدیث کی تاریخ میں عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ صحابہ کے بعد ہی تابعین میں حدیثوں کے متون اور طرق کے جمع کرنے کا ذوق جو غالب آگیا تھا اس نے تقریباً ہر بڑے محدث کے پاس ان تمام حدیثوں کو پہنچا دیا تھا جن سے احکام کا تعلق ہو سکتا تھا۔ الا یہ کہ گنی چنی چند حدیثیں باقی رہ گئی ہوں جیسا کہ امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ احادیث احکام جن کی تعداد حافظ ابن قیم کے تخمینہ کے رو سے پانچسو تو اس وقت ہے جب پیش نظر صرف اساسی حدیثوں کو رکھا جائے۔ ورنہ جن سے تشریحی و تفریعی روشنی ملتی ہے ان کے متعلق ابن قیم کا خیال ہے کہ چار ہزار حدیثوں تک ان کی تعداد پہنچ سکتی ہے۔

جس کا مطلب یہی ہوا کہ چار ہزار نہ سہی پانچسو حدیثوں میں سے صرف تیس حدیثیں امام مالکؒ تک نہیں پہنچی تھیں اور ابنِ عیینہ کو صرف چھ حدیثوں کا علم نہ تھا اور یہی حال تقریباً اس زمانہ میں ان تمام اصحاب حدیث

---

[1] تذکرہ ج ۱ ص ۲۴۲۔

کا تھا جو اسلام کے مرکزی شہروں میں درس حدیث کا کام انجام دے رہے تھے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ ابنِ عیینہ جو حرم میں حدیث کا درس دیتے تھے۔ جہاں ساری اسلامی دنیا سے لوگ آکر ہر سال جمع ہوتے تھے تو کیا جن لوگوں کا مشغلہ ہی دین کی خدمت تھی وہ ابنِ عیینہ کے علم کے حاصل کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا رکھتے ہوں گے؟ چنانچہ الذہبی نے صاف لکھا ہے کہ

کان خلق یحجون والباعث لھم لقی ابن عیینۃ فیزدحمون فی ایام الحج

لوگ حج کرتے تھے اور چونکہ ان کے لئے محرک ابن عیینہ کی ملاقات تھی اس لئے حج کے دنوں میں بہت اژدحام ہو جاتا تھا۔

اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ احکامی احادیث کا ذخیرہ بجز چھ حدیثوں کے ابنِ عیینہ کے پاس موجود تھا۔ تو اب غور طلب بات یہ ہے کہ جو لوگ مکہ معظمہ علاوہ حج کے ابنِ عیینہ سے حدیث سننے کے لئے آتے تھے کیا ان سے اس ذخیرہ کی کوئی حدیث سننے اور لکھنے سے باقی رہ جاتی ہوگی؟ بس اسی پر دوسرے ائمہ اصحاب الحدیث کو قیاس کرنا چاہیے۔ چونکہ بجائے خود یہ ایک طویل بحث ہے اس لئے اتنا اشارہ کافی ہو سکتا ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ ابنِ حزم وغیرہ نے جو عام طور سے اختلاف ائمہ کی بڑی وجہ یہ مشہور کر دی ہے کہ صحابہ ہر جگہ پھیل گئے اور ہر علاقہ میں ان ہی حدیثوں کی اشاعت ہوئی جو اس علاقہ کے اصحاب جانتے تھے۔ قابلِ غور ہے۔ اولاً تو عہد فاروقی تک عموماً ممتاز اصحاب کرام کا قیام مدینہ ہی میں رہا۔ فتوحاتِ فاروقی کے بعد باہم ایک دوسرے سے جدا ہو کر مختلف اقالیم میں جاکر آباد ہوئے ثانیاً جیسا کہ میں نے عرض کیا یوں ہی تابعین میں جن لوگوں نے حدیث کی خدمت کا تہیہ کیا تھا ایک استاد کے پاس سے دوسرے کے پاس۔ دوسرے سے تیسرے کے پاس مسلسل رحلات میں مصروف تھے اور جو بکھرا ہوا علم تھا اُسے سمیٹ رہے تھے مگر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں تو رات دن حج و زیارت کی وجہ سے ان علماء دین کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جس چیز کی تلاش میں وہ سینکڑوں میل کا سفر کرتے تھے وہی چیز جب مکہ اور مدینہ میں انھیں آسانی سے مل سکتی ہوگی اسے حاصل نہ کرتے ہوں گے؟

احکامی حدیثوں کی اشاعتِ عام

ان ہی وجوہ سے میرا خیال ہے کہ ائمہ مجتہدین کے اجتہاد و تفقہ کا تعلق جن حدیثوں سے ہے یعنی اصطلاحاً جنھیں احکامی حدیثیں کہتے ہیں ان کا مجموعہ تقریباً ان مجتہدوں تک پہنچ چکا تھا۔ گویا اس کی ایسی مثال ہے جیسے آج کل ایک خبر چلتی ہے اور ساری دنیا کے اخباروں میں اس لئے چھپ جاتی ہے کہ سب ہی اس کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی تلاش میں جو لوگ سرگرداں تھے تقریباً سب کے پاس کسی نہ کسی طریقہ سے وہ حدیث ضرور پہنچ چکی تھی جو دوسروں کے پاس تھی۔ کم از کم احکامی احادیث جن پر فقہی اختلافات کی بنیاد ہے ان کا تو یہی حال تھا۔ اس لئے اختلاف الائمہ کی یہ توجیہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب اور ہیں۔ چونکہ اس وقت میری بحث کا دائرہ صرف امام طحاوی کی حد تک محدود ہے اس لئے صرف اس اشارہ پر کفایت کر کے میں اب دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

مرویاتِ امام طحاوی کا مرتبہ

خلاصہ یہ ہے کہ الطحاوی کے اساتذہ کی جو نوعیت ہے اور ان کے عہد تک حدیثوں کی اشاعت جو وسعت حاصل کر چکی تھی اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر انصاف سے کام لیا جائے تو علاوہ اپنی دوسری خصوصیتوں کے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یوں بھی طحاوی کے مرویات کو کوئی وجہ نہیں کہ صحاح ستہ کی حدیثوں کا درجہ نہ دیا جائے۔ حالانکہ جب ابنِ ماجہ جیسی کتاب کو جس میں بعضوں کا خیال ہے چند موضوع حدیثیں بھی ہیں صحاح میں لوگوں نے شامل کر لیا ہے تو یقیناً ظلم ہوگا اگر معانی الآثار اور مشکل الآثار جیسی کتابوں کی حدیثوں کو اس شرف سے محروم رکھا جائے ماسوا اس کے طحاویؒ کی حدیثوں کی ایک بڑی خصوصیت جس کا تجربہ سے پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایک حدیث کو مختلف اسناد اور طرق سے روایت کرتے ہیں اور صرف یہی ایک ایسی بات ہے جو محدثین کے مشہور مسلمہ لیشد لبعضہ بعضاً کے حساب سے طحاوی کی روایتوں کو وثاقت کا ایک ایسا مقام عطا کرتی ہے جس سے رجال طحاوی میں اگر تھوڑا بہت ضعف ہو بھی تو اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

اقرار تو حافظ ابن حجرؒ نے بھی کیا ہے۔

کان من الحفاظ المکثرین [52] طحاوی کثیر الحدیث حافظ حدیث تھے۔

امام طحاویؒ کا مرتبہ فی الحدیث

اس کی وجہ یہ تھی کہ علاوہ ان محدثین کے جو مصر کے رہنے والے تھے یا مصر وقتاً فوقتاً آتے رہتے تھے۔ امام طحاویؒ نے صرف انہی بزرگوں سے حدیثیں نہیں پڑھی تھیں عموماً مورخین لکھتے ہیں۔

سمع الکثیر من المصریین امام طحاویؒ نے مصر کے رہنے والے اور مصر میں آنیوالوں
والقادمین الی مصر [53] کی ایک بڑی جماعت سے سماع کیا۔

ان میں سے بعض ممتاز بزرگوں کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے مصر سے باہر نکل کر محدثین کے طریقہ خاص یعنی الرحلۃ پر بھی عمل کیا تھا حافظ لکھتے ہیں۔

خرج الی الشام فسمع فی بیت المقدس امام طحاوی شام گئے اور بیت المقدس اور غزہ اور
وغزہ وعسقلان وتفقہ بدمشق [53] عسقلان میں سماع کیا اور دمشق میں فقہ کی تحصیل کی۔

تیسری صدی ہجری جو طحاوی کا زمانہ ہے اس میں ان ممالک اور علاقوں میں حدیث کے بڑے بڑے حلقہ ہائے درس کی جو کیفیت تھی اس کی شہادت تاریخ دیتی ہے۔ اندازہ کرنا چاہئے کہ اپنے وطن مصر کے سوا جس شخص نے مراکز حدیث کے ان شہروں کی خاک جس حدیث کی تلاش میں چھانی ہو اس کے پاس کتنا بڑا ذخیرہ اس کا جمع ہو گیا ہوگا یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن تیمیہ اپنی اس رائے کے باوجود جس کا ذکر ناصیۂ مضمون میں ہم نے کیا ہے اس اعتراف پر مضطر ہوئے ہیں منہاج ہی میں لکھتے ہیں۔

وکان کثیر الحدیث فقیہاً عالماً امام طحاوی کثیر الحدیث او فقیہ وعالم تھے۔

---

[52] میزان ص ۲۷۵۔ [53] مقدمہ معانی الآثار ص ۳ [54] ص ۲۷۵۔

امام طحاویؒ کے اساتذہ پر مستقل کتاب

امام طحاویؒ کے اساتذہ حدیث کی اس کثرت ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کے اساتذہ کے متعلق بعضوں نے مستقل کتاب لکھی ہے۔ علما رحدیث میں ان کی یہ ایسی خصوصیت ہے جو مشکل سے چند ہی بزرگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ علامہ عبدالقادر الحنفی طبقات حنفیہ میں اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کے استاد علامہ الترکمانی المارديني صاحب جوہر النقی کے پاس یہ کتاب موجود تھی۔ جس زمانہ میں مصری میں حکمت وہ اپنی کتاب "الحاوی فی بیان آثار الطحاوی" لکھ رہے تھے تو ان کے استاد نے یہ کتاب جس میں امام طحاویؒ کے شیوخ کے اسما تھے ان کو دی تھی۔[۵۱] کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کو دیتے ہوئے ترکمانی نے ان سے یہ الفاظ کہے "ھذا ہدیۃ من عندی"۔

القرشی صاحب الطبقات نے اس کا اقرار بھی کیا ہے کہ مجھ کو اس کتاب سے بڑا نفع پہنچا۔ غالباً یہی کتاب لطیف رجال طحاوی کے متعلق ہے جو پچھلے دنوں سندھ کے ایک کتب خانہ میں ہندوستانی عالم کو ہاتھ آئی تھی۔ علامہ عبدالقادر نے طبقات میں "الطحاوی" کے رجال کے متعلق جو اس کتاب لطیف کا تذکرہ کیا ہے تو یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کس کی تصنیف ہے کیونکہ عام طور پر طحاوی کے رجال کی تخریج جن بزرگوں کی طرف منسوب ہے وہ زمانا المارديني کے بعد ہیں مثلاً معانی الآثار کے۔ مقدمہ نگار نے معانی الآثار ہی کے رجال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

واعتنی برجالہ زین المحدثین زین الدین المعروف بابن الھمام والثانی الشیخ قاسم بن قطلوبغا الحنفی۔[۵۲]	اس کتاب کے رجال سے اعتنا زین الدین المعروف بابن الہمام اور شیخ قاسم بن قطلوبغا الحنفی نے کیا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ان دونوں حضرات کا زمانہ علامہ المارديني کے بعد کا ہے کیونکہ المارديني کا

---

۵۱ الجواہر ص ۳۱ا۔ ۵۲ ص ۴۔

سنہ وفات ۷۴۵ ہجری ہے اور ابن ہمام کی وفات ۸۶۱ھ میں ہوئی۔ قاسم بن قطلوبغا تو ابن ہمام کے ہی شاگرد ہیں۔ ان کی وفات کا سنہ ۸۷۹ھ اور بھی اس کے بعد ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ عموماً ابن ہمام اور ابن قطلوبغا ہی کی طرف طحاوی کے رجال کی تخریج جو مشہور ہے یہ صحیح نہیں ہے بلکہ ان دونوں بزرگوں سے پہلے ہی یہ کام کیا جا چکا تھا۔ کم از کم اس سے یہ تو معلوم ہوا کہ معانی الآثار رجال کی حیثیت سے ہمیشہ اہل علم کی مخدوم رہی ہے۔

فن حدیث کے لحاظ سے الطحاوی کا علم میں کیا پایہ ہے اس کی طرف بطور تمہید کے یہ چند اشارات تھے۔ اب میں اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یعنی معانی الآثار اور مشکل الآثار طحاوی کی ان دونوں کتابوں کی خصوصیات پر اس حیثیت سے بحث کروں کہ سنداً و متناً ان دونوں کتابوں سے فن حدیث میں امام طحاوی کا کیا درجہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ البیہقی یا ابن تیمیہ وغیرہ نے جو دعوے کیے ہیں شاید اس کا یہ مطلب ہے کہ یوں الطحاوی کے پاس حدیثوں کا ذخیرہ اگر ہو بھی تو ایک فن کار ماہر کا مرتبہ ان کو علم حدیث میں حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اپنے اس مضمون کو میں دو حصوں میں تقسیم کروں گا۔ پہلے حصے میں ان مباحث کو پیش کروں گا جو ان دونوں کتابوں میں رجال کے متعلق پائے جاتے ہیں اور ان سے معلوم ہوگا کہ فن رجال کے عام معلومات کے علاوہ اس فن کے نازک دقیقوں تک ان کی ماہرانہ رسائیوں کا کیا حال ہے۔ نیز حدیث کی اسناد کے متعلق اتصال و انقطاع کے فیصلے جن تاریخی اور سنینی معلومات کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں اس باب میں ابوجعفر طحاوی کی نظر کیسی ہے۔ وہ اپنے فیصلوں میں سیر اسماء الرجال وغیرہ کے نادر اور قیمتی معلومات سے کس طرح نفع اٹھاتے ہیں۔ ایک ہی روایت جو کسی ایک راوی سے مروی ہے لیکن اس راوی کے تلامذہ کے بیان میں اگر اختلاف پیدا ہو جائے تو ترجیح کے لیے کیا صورت متعین اختیار کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے جن معلومات کی ضرورت ہے امام طحاوی کی وسعت نظر کا اس باب میں کیا حال ہے۔ بہر حال "علم الاسناد" کے ان ہی مہمات کے

متعلق میں طحاوی کے علمی کارنامے انشاء اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں جو پیش کروں گا ان سے خود بخود اس مشاغبہ (پروپگینڈا) کی حقیقت کھل جائے گی جو محض حنفی ہونے کی وجہ سے ان کے متعلق دوسری صفوں میں پھیلائی گئی ہے اور ان ہی مشاغبوں سے متاثر ہو کر لوگ اس وقت تک الطحاوی کے صحیح مقام کو نہیں پہچان سکے ہیں۔ جو علم الاسناد میں حق تعالیٰ کی طرف سے فضلاً و منّاً انھیں عنایت ہوا ہے۔

(۲) دوسرے حصے کا تعلق متن حدیث سے ہوگا۔ اس سلسلہ میں طحاوی کے کام کی جو نوعیت ہے شاید اس کے متعلق یہ دعویٰ بے جا نہ قرار دیا جائے گا کہ اس کی نظیر نہ تو طحاوی سے پہلے جو محدثین گذرے ہیں ان میں پائی جاتی ہے اور نہ بعد کو ان میں کوئی ایسا آدمی اٹھا جو اس نظیر کا ثبوت دے سکتا ہو جو طحاوی نے اپنی علمی شہادت سے پیش کی ہے۔ مختلف آثار و احادیث میں توفیق و ترجیح کے متعلق جو رویہ طحاوی نے اختیار کیا ہے شریعت کے کلیاتی نقطۂ نظر کو پیشِ نظر رکھکر جن نکات و حقائق سے انھوں نے پردہ اٹھایا ہے میری بحث کے اس حصہ میں انشاء اللہ تعالیٰ ان کے نمونے بھی پیش کئے جائیں گے۔ اسی ذیل میں طحاوی کی ان کوششوں کا نمونہ بھی پیش کروں گا جو قرآن کی مشکل آیتوں کے حل میں انھوں نے کی اور ان ہی دو چیزوں پر میرا یہ مقالہ مشتمل ہوگا وعلی اللہ التوکل وبہ الاعتصام

امام ابو جعفر طحاویؒ

علم الاسناد والرجال کے متعلق ان کے علمی کارنامے

ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں علاوہ ان کتابوں کے بد قسمتی سے جن تک مجھے رسائی حاصل نہیں ہے اور نہ اب اس کا پتہ ہے کہ دنیا میں وہ موجود ہیں بھی یا نہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ تاتار کے فتنے نے اسلامی علوم کے کن کن خزانوں کو دنیا سے ناپید کر دیا ہے ورنہ امام طحاویؒ نے جو کتاب خاص کرالکرابیسی کی

کتاب المدلسین جس کا ذکر ہمارے پیشرو نے اپنے مقالہ میں کیا ہے اور اس کا جو نقض ابو جعفر طحاوی نے کیا ہے ان کی تصانیف کی فہرست میں اس کا نام النقض علی کتاب المدلسین للکرابیسی ہے نیز ابو عبید جیسے فاضل جلیل کی کتاب الانساب میں جو غلطیاں انھوں نے نکالی ہیں اور سب سے زیادہ اس فن میں جو قیمتی سرمایہ تھا یعنی مورخین جس کا ذکر "لستاریخ کبیر" کے الفاظ میں کرتے ہیں جس کا بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری الخطیب ابن عساکر وغیرہ نے جس طرز سے تاریخیں لکھی ہیں دراصل وہ اسماء الرجال کی کتابیں ہیں۔ میرا غالب گمان یہی ہے کہ طحاوی کی یہ تاریخ کبیر بھی اسی شان کی کوئی کتاب ہوگی۔ اگر ایسا ہے تو ظاہر ہے کہ اس فن کے کتنے معلومات اس سے بھی بہم پہنچ سکتے تھے۔ لیکن افسوس کہ ان میں سے کسی کتاب کا پتہ ان کے ناموں کے سوا کم از کم میرے علم کی حد تک نہیں ملتا ہے مجبوراً ان کی یہی دو مطبوعہ کتابیں یعنی معانی الآثار و مشکل الآثار (جو ناقص ہونے کے سوا طباعی اغلاط سے معمور ہیں) ان ہی دونوں کتابوں کے مواد سے مجھے کام لینا پڑے گا۔ ایک لحاظ سے ان دونوں کتابوں سے کام لینا اور ان سے شواہد کا پیش کرنا کچھ مناسب بھی ہے۔ کیوں کہ ملا علی قاری کی یہ روایت ہے - کہ معانی الآثار ان کی پہلی اور مشکل الآثار ان کی آخری تصنیف ہے۔ [۱]

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ فن حدیث میں امام طحاویؒ کو جو کمال حاصل تھا وہ اسی وقت سے تھا جب سے انھوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ آپ دیکھیں گے کہ مذکورہ بالا دونوں عنوانوں کے لحاظ سے ان کی دونوں کتابوں کے مضامین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں امام طحاوی کی ان ہی دونوں کتابوں سے پہلے ان رسالوں کو پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ حدیثوں کی اسناد کے متعلق امام طحاوی کے علم کا کیا حال تھا۔

کنواری بالغہ عورت کے نکاح بغیر اذن پر امام طحاوی کی بحث (۱) پہلی مثال اس سلسلہ میں ان کی وہ بحث ہے جو

---

[۱] الفوائد البہیہ ص ۱۸۔

کتاب النکاح کے مشہور اختلافی مسئلہ کے فیصلہ میں انہوں نے کی ہے۔ کنواری بالغہ عورت کے متعلق ایک اختلافی مسئلہ یہ ہے کہ اس سے پوچھے بغیر آیا اس کا نکاح اولیا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اس سوال کے جواب میں منجملہ اور اختلافات کے ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ بن باپ کی لڑکیوں اور باپ والیوں میں بعضوں نے فرق کیا ہے۔ امام مالکؒ کا خیال ہے کہ یتیمہ (بن باپ کی لڑکی) کے نکاح میں تو پوچھنا ضروری ہے۔ لیکن اگر باپ والی لڑکی وہ بالغہ ہی کیوں نہ ہو ان کا خیال ہے جیسا کہ خود طحاوی نے نقل کیا ہے مرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی کنواری بالغہ لڑکی کا نکاح اس کے امر اور استیذان کے بغیر کر دے۔

مگر امام ابوحنیفہؒ وغیرہ کا خیال ہے کہ کنواری لڑکی کے ولی کو خواہ باپ ہو یا کوئی اور یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس لڑکی کا نکاح اس سے اجازت طلبی اور اجازت طلبی پر لڑکی کی خاموشی کے بغیر کر دے (یعنی یا تو لڑکی صاف صاف اجازت دے ورنہ اس کی خاموشی بھی اجازت ہوگی)۔

احناف اپنی تائید میں منجملہ اور دلائل کے ابن عباسؓ اور امام اوزاعی کے دو آثار بھی پیش کرتے ہیں جن میں ابن عباس والی روایت یہ ہے۔ ابوجعفر طحاویؒ اپنی سند سے اس کی تخریج بایں الفاظ کرتے ہیں۔

حدثنا ابو امیۃ و محمد بن علی بن ابی داؤد قالا ثنا الحسین بن محمد المروزی قال حدثنا جریر بن حازم عن ایوب عن عکرمۃ عن ابن عباس ان رجلا زوج ابنتہ وھی بکر وھی کارھۃ فاتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فخیرھا۔	حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اپنی کنواری لڑکی کا نکاح اس کی مرضی کے خلاف کر دیا پھر وہ لڑکی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی تو آپ نے اس کو اختیار دیدیا کہ (وہ چاہے تو نکاح باقی رکھے ورنہ فسخ کر دے)۔

طحاوی اس حدیث کی تخریج کے بعد فرماتے ہیں کہ فکان من طعن من یذھب الی الآثار والتمیز بین رواتھا وتثبت ما روی الحفاظ منھم واسقاط ما روی دونھم ان قالوا الخ۔ یعنی طریقہ جرح و تعدیل کا مشہور قاعدہ کہ ایک ہی استاد کے چند تلامذہ کے بیان میں جب اختلاف ہو تو دیکھا جاتا ہے

کہ ان شاگردوں میں ضبط و عدل ملازمت کے اعتبار سے کس کا درجہ زیادہ بلند ہے اور کس کا کم ہے اور اس معیار پر روایت کے رد و قبول کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ طحاوی نے سب کے مشہور راوی ایوب سختیانی کو پیش کر کے دکھایا ہے کہ جریر بن حازم نے اگرچہ اس حدیث کو ان سے اس طریقہ سے روایت کیا ہے لیکن ان ہی ایوب کے دوسرے تلامذہ مثلاً سفیان ثوری، حماد بن زید، اسمٰعیل بن علیہ جیسی جلیل القدر ہستیوں کا بیان جریر سے دو حیثیتوں سے مختلف ہے۔

(۱) پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ایوب کے ان ثقات شاگردوں کی سند یہ ہے وکیع عن سفیان عن ایوب السختیانی عن عکرمہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ جس سے معلوم ہوا کہ سفیان کی سند میں عکرمہ کے بعد ابن عباسؓ کا ذکر نہیں ہے اور یہ جریر کا اضافہ ہے۔ سفیان اور سفیان کے سوا اسماعیل بن علیہ، حماد بن زید سب کی روایتوں میں جب عکرمہ کے بعد ابن عباس کا ذکر نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ روایت منقطع ہو جاتی ہے یعنی عکرمہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کا راوی مجہول ہو جاتا ہے اور اس جہالت کے ازالہ کے لئے جریر بن حازم نے ابن عباس کا اضافہ کر دیا لیکن جب ایوب کے ثقات تلامذہ ابن عباسؓ کا ذکر نہیں کرتے تو یہ دلیل ہے کہ جریر کا یہ ذاتی اضافہ ہے۔

(۲) دوسرا اختلاف جو ایوب کے ثقات تلامذہ اور جریر کے بیان میں پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جریر اور دوسرے بزرگوں کی روایت میں "ھی بکر" کی جگہ "وکان ثیباً" کا لفظ ہے یعنی باپ کے کئے ہوئے نکاح سے ناراض ہو کر جس عورت نے دربار نبوت میں مرافعہ دائر کیا تھا اور درخواست کی بنیاد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہر سے عورت کو جدا ہونے کا اختیار دیا تھا وہ کنواری (بکر) نہیں بلکہ ثیب یعنی کنواری نہ تھی۔

امام طحاوی نے ایوب کے ان تلامذہ میں سے سفیان ثوری کی سند کی تخریج براہ راست اپنی سند سے کی ہے اور آخر میں فیصلہ کیا ہے۔

هکذا روی هذا الحدیث جریر　اس حدیث کو جریر بن حازم نے اسی طرح روایت
بن حازم وهو رجل کثیر الغلط　کیا ہے اور وہ کثیر الغلط آدمی ہے۔

ظاہر ہے کہ حدیث میں اس قسم کی غلطیاں جو طحاوی نے جریر کے متعلق نکال کر دکھائی ہیں۔ معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔ رواۃ کے تنقید کی اس شکل میں ضرورت ہے کہ ہر راوی کے شاگردوں اور ان شاگردوں میں حفظ و اتقان ضبط و عدل ملازمت وغیرہ کی وجہ سے جو تفاوت ہو ان سے پورے طور پر واقف ہو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ طحاوی کا اس میں کیا حال ہے۔

دوسری مثال | گذشتہ بالا مسئلے کے متعلق احناف کی طرف سے ایک اور حدیث اپنے دعوے کی تائید میں پیش کی جاتی ہے۔ طحاوی اپنی سند سے اس حدیث کو یوں روایت کرتے ہیں۔

حدثنا احمد بن عمران وابراهیم بن داؤد وعلی بن عبد الرحمٰن　ایک شخص نے اپنی باکرہ بیٹی کا
قالوا اخبرنا ابو صالح الحکم بن موسیٰ قال ثنا شعیب بن　نکاح اس کے امر کے بغیر کر دیا پھر
اسحاق الدمشقی عن الاوزاعی عن عطاء عن جابر بن　جب وہ آنحضرت صلعم کے پاس
عبد الله رضی الله تعالیٰ عنه ان رجلا زوج ابنته وهی بکر　آئی تو آپ نے دونوں میں تفریق
بغیر امرها فاتت النبی صلی الله علیه وسلم ففرق بینهما الخ　کرا دی۔

اس روایت کی سند پر طحاوی محدثانہ تنقید کرتے ہوئے دو باتیں لکھتے ہیں۔

(۱) شعیب بن اسحاق جو حدیث کے راوی ہیں ان کے صرف ایک شاگرد ابو صالح حکم بن موسیٰ نے تو بے شک یہ روایت کی ہے کہ یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جابر بن عبد اللہ صحابی روایت کرتے ہیں لیکن انہی شعیب بن اسحق کے دوسرے شاگرد بھی ہیں ان کی روایت میں جابر بن عبد اللہ کا ذکر نہیں ہے چنانچہ طحاوی لکھتے ہیں۔ ان هذا الحدیث لا یعلم ان احداً ممن رواہ عن شعیب ذکر جابرا غیر ابی صالح هذا۔ پھر اپنی سند سے انہی شعیب کے دوسرے معتبر شاگرد علی بن معبد کے حوالہ سے اس

حدیث کی سند یہ درج کرتے ہیں۔ حدثنا محمد بن العباس عن علی بن معبد عن شعیب بن اسحٰق عن الاوزاعی عن عطاء عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم مثلہ ولم یذکر جابرا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عطار تابعی روایت کرتے ہیں اور بیچ میں ایک راوی یعنی صحابی کا نام نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ ابو صالح کا ہے ورنہ شعیب کے دوسرے تلامذہ بجائے اتصال کے اس کو بھی منقطع شکل ہی میں روایت کرتے ہیں۔

تیسری مثال | پھر اسی حدیث پر ایک اور رجالی تنقید کرتے ہیں کہ شعیب نے امام اوزاعی سے یہ حدیث جو روایت کی ہے اس کی حالت تو یہی ہے لیکن اوزاعی کے دوسرے تلامذہ مثلاً عمرو بن ابی سلمہ جس طرح اس روایت کو نقل کرتے ہیں فبین من فسادہ ما هو اکبر من هذا اس فساد اکبر کا اظہار کرتے ہوئے عمرو بن ابی سلمہ والی روایت کو اپنی سند سے پہلے درج کرتے ہیں جو یہ ہے۔ حدثنا ابراهیم بن ابی داؤد قال اخبرنا عمرو بن ابی سلمہ قال ثنا الاوزاعی عن ابراهیم بن مرۃ عن عطاء عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بذلك۔ مطلب یہ ہے کہ اوزاعی کے شاگرد عمرو ابن ابی سلمہ کی سند میں جابر بن عبداللہ کے سقوط کے سوا ایک نیا اضافہ یہ ہے کہ اوزاعی اور عطاء کے درمیان ایک اور راوی ابراہیم بن مرۃ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ امام طحاوی کہتے ہیں۔

وابراهیم بن مرۃ هذا ضعیف الحدیث لیس عند اهل الآثار من اهل العلم اصلا

ابراہیم بن مرۃ ضعیف الحدیث ہیں اہلِ آثار کے نزدیک اہلِ علم میں سے بالکل نہیں ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ عنعنہ کی وجہ سے راوی نے درمیان کی ایک ضعیف کڑی کو ترک کر کے تدلیس کا ارتکاب کیا اوزاعی کے جو دوسرے شاگرد عمرو بن ابی سلمہ تھے انھوں نے راز کھول دیا اور شعیب کی روایت میں یہ بات بند رہی۔

ظاہر ہے کہ عنعنہ کے اندر تدلیس کر کے جو لوگ قصداً یا خطاءً اس قسم کی صورت پیدا کر دیتے ہیں

ان کا پتہ اس کو چل سکتا ہے جسے فنِ حدیث میں حذاقت حاصل ہو۔ ورنہ جو اس فن سے لگاؤ نہ رکھتا ہو وہ اس سے کیا واقف ہو سکتا ہے۔ اگر کلیات معلوم بھی ہوں تو ان کا جزئیات پر منطبق کرنا آسان نہیں۔ واقعہ تو یہی ہے کہ یہ کمال ان ہی لوگوں کو حاصل ہو سکتا ہے جن کے سامنے حدیث کے تمام طُرق ہوں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ہی روایت ہے جسے امام اوزاعی روایت کرتے ہیں مگر اس کی ایک سند شعیب دمشقی کے توسط سے چلتی ہے۔ شعیب سے بھی دو آدمی روایت کرتے ہیں۔ ایک ابو صالح دوسرے علی بن معبد۔ پھر ان ہی اوزاعی سے اسی روایت کو شعیب کے دوسرے ساتھی عمرو بن سلمہ روایت کرتے ہیں۔ تینوں سندوں کو سامنے رکھنے کے بعد پتہ چلا کہ (۱) عطا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان جابر بن عبداللہ کا اضافہ یہ ابو صالح کا کام ہے۔

(۲) اوزاعی اور عطار کے درمیان ابراہیم بن مرہ کے نام کو چھپا دیا چونکہ وہ ضعیف ہیں اس لئے شعیب کی سند میں ان کا نام ساقط کر دیا گیا ہے۔ اس راز کو اوزاعی کے شاگرد عمرو بن سلمہ نے کھولا۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس کے سامنے یہ تینوں اسناد نہ ہوں مشکل ہی سے روایت کے ان دو عیبوں یعنی انقطاع اور تدلیس سے واقف ہو سکتا ہے۔ امام طحاویؒ کا کمال ہے کہ تحشیوں کے مختلف اسناد اور طُرق کے جمع کرنے میں انھوں نے مستقل کوشش کی ہے اس لئے کہ وہ جن سنون کا بھی ذکر کرتے ہیں وہ انھی کی اپنی سند ہوتی ہے اور اس کے بعد پھر فن انتقاد کی رو سے ان سندوں میں مقابلہ کرتے ہیں۔ مقابلہ کے بعد جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس سے حدیث کی وثاقت وعدم وثاقت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ عملی طور پر بڑے سے بڑے محدث کا کام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

چوتھی مثال | کتاب الزکوٰۃ کا ایک مشہور اختلافی مسئلہ اونٹوں کی زکوٰۃ کے متعلق ہے یعنی ایک سو بیس اونٹوں کے گلہ تک زکوٰۃ کا جو حساب ہے ائمۂ امصار اس حساب پر متفق ہیں لیکن پھر اس میں اختلاف ہے کہ جن گلوں میں ایک سو بیس سے زائد اونٹ ہوں ان کی زکوٰۃ کس حسابی قاعدہ سے وصول کی جائے؟

امام ابو حنیفہؒ تو وہی ابتدائی حساب یعنی پانچ زائد ہوں تو ایک بکری۔ دس زائد ہوں تو دو بکریاں۔ پندرہ زائد ہوں تو تین بکریاں بیس میں چار بکرے اور پچاس زائد میں بنت مخاض۔ الغرض اس طرح ایک سو پینتالیس کے گلہ سے ایک بنت مخاض[1] اور دو حقے[2] وصول کئے جاتے ہیں اور ایک سو پچاس میں تین حقے۔ ایک سو پچاس کے بعد امام ابو حنیفہؒ پھر حساب کو نئے سرے سے شروع کرتے ہیں جس کا یہ مطلب ہے کہ ایک سو بیس سے پہلے پچاس اونٹوں تک میں جو حساب جاری ہوتا تھا اس کو پھر نئے سرے سے جاری کریں گے اور دو سو جب ہو جائے تو چار حقے ہو جائیں گے۔ چونکہ اس حساب کا مدار ایک سو بیس سے پہلے والے پچاس اونٹوں کے متعلقہ حساب پر ہے اس لئے اس حسابی حنفی طریقہ کا اصطلاحی نام "الخمسینیات" ہے۔ امام شافعیؒ ایک سو بیس کے بعد حساب کے ابتدائی قاعدہ کا اعتبار نہیں کرتے یعنی حساب کا قاعدہ ایک سو بیس کے بعد بدل جاتا ہے اور چالیس چالیس پر پچاس پچاس کی ٹکڑیاں بنا کر محصول کا حساب کیا جاتا ہے۔ اس لئے حساب کے اس طریقہ کا نام "الاربعینیات والخمسینیات" ہے۔ یعنی ہر چالیس پر ایک بنت لبون اور ہر پچاس پر ایک حقہ امام احمدؒ کی رائے بھی اسی کے قریب قریب ہے۔ امام مالکؒ بھی اگرچہ ایک سو بیس کے بعد حسابی قاعدہ کے بدل جانے کے قائل ہیں لیکن یہ تغیر ایک سو بیس ہی کے بعد شروع نہیں ہوتا بلکہ جب تک ۱۳۰ کی تعداد پوری نہ ہو محصول ایک سو بیس ہی کے حساب سے وصول ہوگا۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ میں بس یہی فرق ہے کہ ایک سو بیس کے بعد اگر ایک عدد کا اضافہ ہو جائے گا تو امام شافعیؒ کے نزدیک حسابی قاعدہ بدل دیا جائے گا۔ لیکن امام مالکؒ دس کے اضافہ کے بعد یعنی تیس کی تکمیل کے بعد جدید حسابی قاعدہ کو جاری کرتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک پیچیدہ حسابی چکر ہے۔ مسئلہ کا سادہ عنوان یہ ہے کہ ایک سو بیس کے بعد زکوٰۃ کی وصولی کس حساب سے کی جائے گی۔ امام طحاویؒ نے "باب فرض الزکوٰۃ فی الابل السائمۃ فیما

[1] جو دوسرے سال میں لگا ہو۔ [2] جو چوتھے سال میں لگا ہو۔

"زاد علی العشرین ومائۃ" کا عنوان قائم کرکے تینوں خیالات کا تذکرہ کرنے کے بعد امام شافعیؒ جس حدیث سے استدلال کرتے ہیں اپنی سند سے اسے بایں الفاظ درج کیا ہے۔ حدثنا محمد بن عبد اللہ الانصاری قال حدثنی ابی عن ثمامۃ بن عبد اللہ عن انس رضی اللہ عنہ الحدیث۔ آگے حدیث کا متن ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحرین کی مال گزاری وصول کرنے کے لئے عہد صدیقی میں حضرت انسؓ بھی ایک دفعہ بھیجے گئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وصولی زکوٰۃ کا جو ہدایت نامہ ان کو لکھ کر دیا تھا اسی فرمانِ صدیقی میں یہ بھی تھا۔

ان الابل اذا زادت علی عشرین ومائۃ ففی — اونٹ جب ۱۲۰ سے زائد ہوجائیں تو پھر ہر چالیس میں
کل اربعین بنت لبون وفی کل خمسین حقۃ — ایک بنت لبون اور ہر پچاس میں ایک حقہ آئیگا۔

اور یہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے۔ طحاوی نے حسب دستور پھر دوسرے راویوں کے مویدات پیش کئے ہیں جن میں مرفوعات کے سوا ابن مسعود ابراہیم نخعی کے آثار بھی ہیں اور الصدقات کے کلی قوانین کی رہنمائیاں بھی۔ لیکن آخر میں خود لکھتے ہیں کہ شوافع وموالک کی طرف سے سب کے جواب میں کہا جاتا ہے۔

معنا الآثار المتصلۃ شاھدۃ — یعنی آثار صحابہ اور قیاسی دلائل تمہارے پاس جتنے بھی قوی ہوں لیکن صحیح
لقولنا ولیس معہ مخالفنا — متصل حدیث جیسی ہمارے پاس ہے تمہارے پاس نہیں ہے۔

طحاوی غالباً کچھ اس اعتراض پر برہم ہوجاتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ قیل لھم اما علی مذھبکم فالکثرھا لا یجب لکم بہ الحجۃ علی مخالفکم۔

مطلب یہ ہے کہ اتصال وصحت کا یہ سارا دعویٰ صرف ہمارے مقابلہ میں ہے ورنہ خود آپ لوگ جن طریقوں سے دوسروں کی حدیثوں کو رد فرماتے ہیں اگر ان ہی طریقوں کے حساب سے جانچا جائے تو آپ کے پاس بھی جو کچھ ہے وہ آپ کی تائید میں مخالف کے خلاف کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ آگے اور لہجہ کو

درشت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

لانہ لو احتج علیکم بمثل ذلک لم — کیونکہ اگر تمہارا مخالف اس حدیث سے استدلال

تسوغوہ ایاہ ولجعلتموہ باحتجاجہ — کرتا تو تم اس کو برداشت نہ کرتے اور محض اس استدلال

بذلک علیکم جاھلاً بالحدیث۔ — کے باعث تم اس کو حدیث کا جاہل قرار دے دیتے۔

اور اب اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہی ثمامہ بن عبداللہ جو دراصل حضرت انس رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں صدیقی فرمانِ صدقات کے سلسلہ میں ان کی مذکورہ بالا روایت کا ذکر کرتے ہیں جس پر مخالفوں کو بڑا ناز ہے۔ اس کے بعد امام طحاویؒ یہ دکھلاتے ہیں کہ دوسروں کی پیش کردہ حدیثوں میں جو نقص آپ لوگ نکالتے ہیں وہی نقائص اس حدیث میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس سے آپ کے خیال کی تائید ہوتی ہے اس لئے ان سے اغماض برتا جاتا ہے۔ پھر ان نقائص کو مختلف طریقوں سے دکھاتے ہیں پہلی بات تو یہی ہے کہ

ان حدیث ثمامۃ بن عبداللہ — ثمامہ بن عبداللہ کی حدیث کو صرف عبداللہ بن

انما وصلہ عبداللہ بن المثنی وحدہ — المثنی نے متصل قرار دیا ہے ان کے علاوہ ہمیں کسی

لا نعلم احداً وصلہ غیرہ وانتم — ایسے شخص کا نام معلوم نہیں جس نے اس کو متصل کہا ہو

لا تجعلون عبداللہ بن المثنی حجۃ۔ — اور تم عبداللہ بن المثنی کو حجت تسلیم نہیں کرتے۔

طحاوی کے مذکورہ بالا فقرہ کی تفہیم کے لئے حسب ذیل بیان کو سامنے رکھا جائے۔

حدیث الصدقات | واقعہ یہ ہے کہ "الصدقات" کے متعلق ذخیرۂ احادیث میں چار کتابوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور بیان کرتے ہیں کہ یہ چاروں کتابیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھوائی ہوئی ہیں۔

(۱) ایک کتاب الصدقات تو وہی ہے جسے ہم نسخۂ صدیقی کہہ سکتے ہیں یعنی یہی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی کتاب جس کا ذکر طحاوی نے بھی اپنی سند سے کیا ہے۔ امام بخاری نے بھی اپنی کتاب میں

مختلف مقامات میں ایک ہی سند محمد بن عبد اللہ بن المثنیٰ الانصاری عن ابیہ عن ثمامۃ الخ جو طحاوی کی سند ہے اس کا ذکر کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے اسی روایت اور اسی سند کے ساتھ احمد ابن حنبل کی روایت میں یہ دلچسپ اضافہ بھی درج کیا ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے تھے کہ

ان ابابکر لما استخلف الی البحرین	حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے مجھکو
وکتب لہذا الکتاب وختمہ	بحرین بھیجا اور یہ فرمان لکھکر دیا اور اس پر آنحضرت
بخاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم و	صلعم کی انگوٹھی سے مہر لگائی۔ اس انگوٹھی پر تین سطریں
کان نقش الخاتم ثلاثۃ اسطر۔ محمد سطر رسول سطر اللہ	منقوش تھیں۔ محمد رسول اللہ

بہرحال "الصدقات" کے باب میں اس نسخۂ صدیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ امام شافعیؒ سے البیہقی نے اس کتاب کے متعلق یہ رائے نقل کی ہے۔

قال الشافعی حدیث انس حدیث	امام شافعیؒ فرماتے ہیں حضرت انسؓ کی حدیث
ثابت من جھۃ حماد بن سلمہ وغیرہ عن	حماد بن سلمہ وغیرہ کی سند سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبہ ناخذ	سے ثابت ہے اور ہم اسی کو لیتے ہیں۔

جیسا گذر چکا ایک طویل کتاب ہیں جو فلسکیپ میں آسکتی ہے یہ الفاظ بھی ہیں۔

فاذا زادت علی عشرین ومائۃ ففی کل	جب ایکسو بیس پر زائد ہو تو ہر چالیس میں ایک
اربعین ابنۃ لبون وفی کل خمسین حقہ	بنت لبون اور ہر پچاس میں ایک حقہ آئیگا۔

یعنی وہی اربعینات و خمسینات کے حساب سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی جیسا کہ حجازیوں (مالکیوں اور شافعیوں) کا خیال ہے۔

(۲) دوسری کتاب وہ ہے جو عمرو بن حزم عامل (کلکٹر) یمن کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔

عمرو بن حزم اس "صحیفہ نبویہ" جس کی حیثیت گویا ایک قانونچۂ مبارک یا ایسے فرمان شاہی کی ہے جس میں یمن کے (راجہ) کے تین لڑکوں کو جو حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے خطاب کر کے بعض مہمات امور کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ یہ صحیفہ بھی کافی طویل ہے۔ کم از کم دو ورق فلسکیپ میں آسکتا ہے۔ ابتدائی الفاظ یہ ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ من محمد النبی (منجانب محمد النبی) الی شرحبیل بن عبد کلال ونعیم بن عبد کلال والحارث بن عبد کلال قیل ذی رعین ومعافر وھمدان امابعد۔ الخ

آگے فرمان مبارک کا مضمون شروع ہوتا ہے جیسا کہ عرض کیا گیا۔ اس میں اسلام کے دیگر مہمات و مطالبات کے ساتھ ساتھ الصدقات کے قانونی کلیات کا بھی ذکر ہے یعنی زمین نخلستان سینچی ہوں یعنی سینچ کر ان کی پرورش کی جاتی ہو یا خودرو ہوں اسی طرح تری کی زمین اور خشکی کی زمین مویشیان جو افزائش نسل کے لئے پلے جاتے ہوں یعنی جن کا اکثر حصہ چراگاہ میں بسر ہوتا ہو۔ نقدین (سونا چاندی) ان سب سے وہ محصول جو حکومت ملک نے بے روزگاروں اور غریبوں کے لئے وصول کرے گی تفصیل درج تھی۔ اس لئے یوں تو اس کتاب کی شہرت عام طور پر تھی لیکن اس کو اہمیت حضرت عمر بن عبدالعزیز الخلیفہ کے زمانے میں ہوئی۔ طحاوی کے الفاظ یہ ہیں۔

لما استخلف عمر بن عبد العزیز ارسل الی المدینۃ یلتمس کتاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الی عمرو بن حزم فی الصدقات ص ۲۱۶

جب عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ایک شخص کو مدینہ بھیجکر آنحضرت صلعم کا وہ مکتوب گرامی منگوایا جو آپ نے صدقات کے متعلق عمرو بن حزم کو بھیجا تھا۔

(۳) تیسرا نسخہ کتاب الصدقات کے باب میں جو اہمیت رکھتا ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کی طرف منسوب ہے۔ الزہری اس کے راوی ہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ اپنے تلامذہ کے سامنے اس کتاب کو پیش کرتے تھے جیسا کہ الطحاوی نے بھی لکھا ہے۔ نسخۃ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الذی کتب فی الصدقۃ عند آل عمر بن الخطاب۔ (یہ اس کتاب کا نسخہ ہے جو آنحضرت صلعم نے صدقہ کے بارہ میں لکھا تھا حضرت عمر بن الخطابؓ کی اولاد کے پاس ملا۔

الزہری اس کے بعد کہتے تھے: اقرأنیہا سالم وعبید اللہ ابنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فوعیتہا علی وجہہا۔ (مجھکو حضرت عمرؓ کے صاحبزادوں سالم اور عبد اللہ نے اس کو پڑھایا اور میں نے اسے بتمامہا یاد کر لیا۔

دراصل اس نسخہ کو بھی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانے میں زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے عمرو بن حزم کے صحیفہ کے ساتھ ساتھ اس کتاب کا بھی نسخہ تلاش کروایا۔ خصوصاً اس کے متعلق یہ مشہور تھا جیسا کہ الزہری ہی کے حوالے سے البیہقی نے نقل کیا ہے۔ جو کتاب آنحضرت صلعم نے وفات سے پہلے صدقہ کے بارہ میں لکھی تھی سالم نے مجھکو وہ پڑھائی (ج ۴ ص ۸۸) یعنی اس کی حیثیت گویا آخری فرمان مبارک کی تھی۔

بہرحال الطحاوی نے یہی نقل کیا ہے کہ عمر بن عبد العزیز خلیفہ نے مدینہ میں کتاب الصدقات کی جستجو کرائی تو ایک نسخہ تو وہی عمرو بن حزم والا ان کو ملا اور دوسرا یہی فاروقی نسخہ تھا۔ الزہری اس صحیفہ فاروقی کو جب مذکورہ بالا الفاظ "یعنی سالم اور عبد اللہ ابن عمر نے مجھے یہ کتاب پڑھائی" کہتے تو اس کے ساتھ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ یہ وہی نسخہ ہے جو عمر بن عبد العزیز نے سالم اور عبد اللہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادوں سے لکھا تھا۔

یہاں یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ سالم و عبد اللہ ابن عمرؓ سے مراد یہ نہیں ہے کہ یہ دونوں براہ راست حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے تھے۔ بلکہ یہ دونوں حضرت عمرؓ کے پوتے ہیں اور ان ہی سے زہری نے اس نسخہ کو پڑھا تھا۔ ابوداؤد میں الزہری کے الفاظ یہ ہیں۔ قال الزہری حین روائتہ ھذہ الکتاب ھی التی انتسخ عمر بن عبد العزیز من عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمر و سالم بن عبد اللہ بن عمر فذکر الحدیث۔ ص ۱۵۶۔ ابوداؤد مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

(باقی آئندہ)